بشریٰ ثمینہ

اردو میں شخصیت نگاری کے نئے رجحانات کا تنقیدی محاکمہ

'Shakhsiat Nigari' has a strong identity as a literary genre in the tradition of Urdu literature. This article deals with the analytical study of prominent writers of this genre from different aspects. New trends in this genre are also discussed in detail.

انسان کی ذات ازل سے ایک معمہ ہے۔ شخصیت انسانی ہمیشہ سے ادیبوں اور نفسیات دانوں کے لیے دلچسپی کی حامل رہی ہے اور حیات انسانی کی جانچ پرکھ کے لیے نئے نئے اصول وضوابط بنتے رہے لیکن ہر انسان کی شخصیت دوسری سے مختلف ہوتی ہے اور ہم کوئی قانون ہر دوسرے پر لاگو نہیں کر سکتے۔

اگرچہ ادب کی ہر صنف ہی اپنے اندر رنگارنگی اور دلچسپی لیے ہوئے ہوتی ہے مگر شخصی خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ہے کہ جس کا حسن اور چاشنی شخصیات کی رونق اور دم قدم سے ہے۔ شخصیت نگار شخصیت کی اصلی تصویروں میں کچھ ایسے تناسب سے رنگ وروشنی دیتا ہے کہ اس کی ایک شکل واضح ہو کر سامنے آجائے وہ اپنی پسند وناپسند کو نہیں دیکھتا بلکہ ممدوح شخصیت کو بڑے رچاؤ اور فطری انداز میں پیش کر دیتا ہے۔

۲۱ ویں صدی کے ساتھ ہی ہمارے معاشرے میں انفرمیشن ٹیکنالوجی کی بدولت کھلے آسمانوں کی پالیسی اس طرح آئی کہ پہلے سیٹلائٹ اور پھر کیبل کے ذریعے پرائیویٹ چینل اور غیر ملکی میڈیا ہمارے متوسط طبقے کے گھروں میں بھی داخل ہو گیا۔ نہ صرف عورت اور مرد کے جسمانی تعلق بلکہ ذہنی وحسیاتی رفاقت کے احساس اور بصیرت کے حوالے سے وہ معلومات نوعمر بچوں تک پہنچ رہی ہیں جو ماضی میں شائستہ پیرائے میں کتابوں میں چھپ کر مردود نہیں تو مطعون ضرور ٹھہرتی تھیں۔ اسی طرح ایڈز کی تشہیری مہم میں بھی جو پیرایہ اظہار اور اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ دو عشرے پہلے اس کا تصور نہیں کیا جاتا تھا اس کے ساتھ ساتھ سائنسی شعور کی بدولت ماورایت اور توہم پرستی کے بہت سے ستون زمین بوس ہوئے اس میں شک نہیں کہ ہماری دیسی معاشرت میں ابھی بھی حسن عقیدت مزار پرستی اور شخصیت کی تحسین کے والہانہ انداز موجود ہیں مگر مجموعی طور پر یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ ہر انسان میں بشری کمزوریاں ہوتی ہیں اور بڑے انسانوں میں یہ کمزوریاں کم ہو سکتی ہیں مگر نمایاں بھی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ احساس بھی کم ہو رہا ہے کہ محض یک طرفہ توصیف کسی شخصیت کا گہرا نقش ابھارنے سے قاصر رہتی ہے اس لیے میڈیا کے

Scanned by CamScanner

زیر اثر بہت کچھ کتابوں میں بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ اردو میں اس سلسلے میں نئے موضوعات اور جدید اسلوب کی آمد کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کشور ناہید نے جب اپنی آپ بیتی لکھی: ''ایک بری عورت کی کتھا'' تو اس میں شک نہیں کہ اپنی دانست میں اس نے جرات مندانہ پیرایہ اظہار اختیار کیا جس پر مغربی عقیدے اور ادب کے اعترافات کی روایت کے اثرات بھی ہیں مگر اسی کشور پر جب ان کے دو عزیز ساتھی قلم کاروں نے قلم اٹھایا تو نہ صرف کشور کو بلکہ اس سے ہمدردی رکھنے والوں کو بھی صدمہ ہوا۔ ان کا المناک روپ یہ ہے کہ جب کبھی کسی خاتون قلم کار پر کوئی بھی معاصر لکھنے لگتا ہے تو وہ جب تک اپنے قارئین کو یہ یقین نہ دلا دے کہ وہ اس کے وجود کے تمام پہلوؤں سے واقف ہے اپنی تحریر سے مطمئن نہیں ہوتا۔ عورت کی ذہنی رفاقت یا مجلسی فیض رسانی سے زیادہ اس کے وجود کی قفل کشائی مرد قلمکار کے لیے اہمیت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ احمد بشیر نے اپنے مرقعوں کی کتاب ''جو ملے تھے راستے میں'' میں جب کشور ناہید کی شخصیت نگاری کی تو اس کا عنوان ''ہی چھپن چھری'' رکھا جس کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''کشور ناہید پہلی نظر میں ہی مجھے سخت بدتمیز لڑکی لگی تھی اور واقعی وہ بدتمیز ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے اچھے آداب کا علم نہیں وہ روحانی طور پر ملامتی صوفیوں سے تعلق رکھتی ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ بھری محفلوں میں ایسی حرکات کرے جن پر لوگ ملامت کریں وہ کسی کی کوئی بات نہیں مانتی وہ ہر ایک کو للکارتی ہے وہ کوشش کرتی ہے کہ اس کے جانے کے بعد تمام عورتیں اور مرد جی بھر کر اس کی برائی کریں اس سے خار کھائیں اس کو نفرت سے یاد کریں مگر اس کو بھول نہ سکیں اس نفرت سے جو وہ عورتوں کے دلوں میں اپنے لیے پیدا کرتی ہے اس سے اس کا نسوانی غرور بھڑکتا ہے۔ ہی وہ چھلانگ مار کر ان کے دائرے سے نکل جاتی ہے اور کہتی ہیں دیکھو میں تم میں سے نہیں وہ مردوں سے کہتی ہے میں ایک چیلنج ہوں میں تمہارے مضبوط جسموں کو نہیں مانتی میں تمہارے فہم و ادراک سے متاثر نہیں ہوں تم محض کن کٹے بچے ہو تم ایک چاٹنا کھا کر رونے اور افسانے لکھنے لگتے ہو تم کچھ بھی نہیں ہو اور مرد اپنا گال سہلاتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں یا اس کے گرد دھمال ناچنے لگے ہیں کشور ناہید اسی طرح عورتوں اور مردوں کے درمیان پل پر کھڑی دونوں کو نچاتی ہے وہ کسی ایک دائرے میں جانے پر تیار نہیں۔''(۱)

اس طرح اس مرقعے میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے بہت غور کیا مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ گالیاں کیوں سنتی ہے پھر ان گالیوں کو بے تکلف دوستوں کے سامنے دہراتی کیوں ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کا قد کسی قدر چھوٹا ہے اس کے نین نقش بھی مدہم ہیں اور اس کا اسے شدت سے احساس

Scanned by CamScanner

ہے مگر اس بظاہر کمزور ہونے کے اندر وہ ایک بھرپور اور لبریز عورت ہے اس کا حق تھا کہ وہ ہر لحاظ سے انسانیت کا ایک مکمل مجسمہ ہوتی، اس کو قدرت کی سنگدلی پر غصہ آتا ہے، اسی لیے وہ عورت ہونے سے انکار کر دیتی ہے اور مرد دوستوں کو بار بار للکار کر ان کے مساوی ہونا چاہتی ہے۔ (۲)

یہ اقتباس دیکھیے:

''وہ ایک درانتی ہے جو اپنی فصل نہیں کاٹ سکتی وہ ایک گلاب کی ٹہنی ہے کہ جس کا جی چاہے اس سے الجھ کر اپنا دامن پھاڑ لے وہ اکیلی اداس اور غمگین عورت ہے مگر نسائیت کا بھرپور پیمانہ ہے جو چھلک کر خالی ہو جانے کی بجائے شیشے میں آئے ہوئے بال میں سے رس رس کر خالی ہو رہا ہے وہ ابلتی ہوئی اچھلتی ہے مگر خالی وہ پلیٹ فارم پر پڑی گٹھڑی ہے جس کو چھوڑ کر جانے والے مسافر کو یاد بھی نہیں کہ وہ اس میں کیسے کیسے رنگیں خواب چھوڑ کر چلا آیا۔'' (۴)

احمد بشیر ایک مصلحت سوز ادیب تھا اس نے اپنی بہن پروین عاطف کی سہاگ رات کے بارے میں بھی لکھنے میں بخل سے کام نہیں لیا مگر وہاں پروین سے جو لگاؤ اور ہمدردی ہے وہ کشور کے تذکرے میں مفقود ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ مرد لکھنے والے کی ساری طنازی اور طراری عورت پر مکمل دسترس یا رسائی کے دعووں میں چھپی ہے۔ پھر جاوید شاہین نے اپنی آپ بیتی ''میرے ماہ و سال'' میں جب کشور کا ذکر کیا تو اس بات کو نظر انداز کیا کہ بیوگی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے والی کشور اپنے معاش اور سماجی تکریم کے لیے ابھی تک جدوجہد کر رہی ہے۔ جاوید شاہین جو خود کشور کا دوست ہے اس کے بارے میں یہ لکھنے سے نہیں چوکتا کہ کشور دوہرے معیارات رکھتی ہے وہ اپنے لیے جتنی آزادی مانگتی ہے اپنے شوہر یا بیٹے کو دینے کے لیے تیار نہیں حتی کہ اس کے بیٹے نے اپنی مرضی سے جو شادی کی اس پر اس کا ردعمل اور اپنی بہو سے سلوک روایتی ساسوں والا تھا۔ یہاں سے حقوق نسواں یا نسائیت کی فکری تحریک کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہمارے مرد لکھنے والوں نے عورت کو ایک فکری وجود کے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ اس کے نزدیک عورت صرف کھیلنے کی چیز ہے اور مرد قارئین سے داد وصول کرنے کا ذریعہ۔ منٹو کے نور جہاں سرور جہاں سے لے کر احمد بشیر کے چھپن چھری تک عورت صرف ایک بدن کا نام ہے جسے اپنی تسکین کے لیے مختلف مرد درکار ہیں۔ یہ انداز ایک خاص طرح کا Discourse پیدا کرتا ہے۔ جس میں بیان کے اصول طے کر دیئے گئے کہ اب تمہاری مجلس میں عورت آتی ہے اس کی رضامندی سے یا پھر ترغیب کے ساتھ اس طرح سے اپنے بستر پر لے جایا جائے کہ بعد میں مردانہ فتوحات کے مبالغہ آمیز بیان سے اپنی آپ بیتیاں مرقع نگاریاں اور یادوں کے نگار خانے کو سجایا جائے۔ اس تناظر میں قدرت اللہ شہاب کا شہاب نامہ ایک اور جمالیاتی تعبیر پیش کرتا ہے وہ آپ بیتی جس میں حکمرانوں کی ہوس اقتدار اور محلاتی سازشوں

Scanned by CamScanner

کا بڑا دلچسپ تذکرہ ہے مگر اپنے آخری تاثر میں اس پوری کتاب کی حسی کائنات انہیں تین عورتوں پر استوار ہے ایک ماں جی، دوسری چندر وتی تیسری ڈاکٹر عفت ۔ ماں معصومیت اور دعا کی تجسیم ہے، چندروتی ایک شعلہ مستعجل کی طرح تخلیق کار میں گداز بیدار کرتی ہے جب کہ آہستہ آہستہ موت سے ہم آغوش ہونے والی بیوی ڈاکٹر عفت زندگی کی بازیابی کا وسیلہ بن جاتی ہے اور یوں شہاب کا یہ نگار خانہ ان مرد لکھنے والوں کے لیے کفارے کا موجب بن جاتا ہے جو عورت کو محض ایک لذت بھرا وجود خیال کرتے ہیں یہاں ایک لطیفے کی صورت یہ ہے کہ وہی قدرت اللہ شہاب جب آغا بابر کی شوخ نظر اور قلم کا موضوع بنتے ہیں تو وہ ایوب خاں کے کسی فوجی ڈاکٹر کی پان چباتی رنگین بیوی کو بھی شہاب کے اس گھر میں دیکھ لیتے ہیں جس میں ان کی بیوی نہیں ہوتیں اور شہاب بھی کہلوا دیتے ہیں کہ میں بھی گھر پر نہیں ہوں اور وہی شہاب ممتاز مفتی کی روحانیات اور جنسیات اور ضروریات کو جوڑنے والی نثر کا موضوع بنتے ہیں تو الکھ نگری کے ہیرو بن جاتے ہیں جن پر اسرائیلی جادوگر بھی مختلف داؤ پیچ آزماتے ہیں۔ اسے سانڈنی سواروں کے روحانی رقعے آتے ہیں اور تیسری طرف بانو قدسیہ جب شہاب پر مرد ابریشم لکھتی ہیں تو وہ اپنے شوہر اور پیرومرشد اشفاق احمد کو ان سے بڑا آدمی ثابت کرنے کی مشرقیت میں مبتلا ہوتی ہیں جو اپنی روحانی اور سماجی عظمت کے باوجود اشفاق احمد گوشت اور پیپ میں دھنسے ہوئے قدرت اللہ شہاب کے ناخن انتہائی توجہ اور ریاضت سے صاف کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کے ذریعے ممتاز مفتی کی حق گوئی کا پردہ بھی فاش ہوتا ہے کہ وہ ممتاز مفتی جو اپنے باپ کے بارے میں ناگوار سے ناگوار بات کو کہہ دینے کو حق گوئی شمار کرتا ہے اپنے بیٹے عکسی مفتی کے بارے میں بانو قدسیہ کا یہ سچ برداشت نہیں کر سکتا کہ عکسی مفتی نے دوسری شادی کی تھی۔ گویا شخصیت نگاری کے نتیجے میں وہ شخصیتیں تو سامنے آتی ہیں جن کا ذکر مواد کے طور پر کیا جاتا ہے مگر خود شخصیت نگار بھی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ادبی دنیا میں اس طرح سے آتے ہیں کہ دنیائے تنقید نئے سوال اٹھا سکتی ہے۔

ابن انشاء، مشتاق احمد یوسفی اور رشید احمد صدیقی کی حس مزاح اور تخلیقی جملوں نے نئی نسل میں اس طرح سے ابھارا کہ شخصیت نگاری کے نئے اسالیب وضع ہوئے اب ڈاکٹر یونس بٹ، رضی الدین رضی، اختر شمار، شاکر حسین شاکر اور مزمل بھٹی جیسے نوجوان اک بے ساختہ اسلوب میں مرقع نگاری میں منہمک دکھائی دیتے ہیں جن کے نزدیک شخصیت نگاری نہ تو سیرت نگاری ہے کہ جملہ تفاصیل لائی جائیں اور نہ افسانہ کہ اس کے لیے کچھ فنی لوازمات فراہم کیے جائیں بلکہ یہ تو محض کسی شخصیت کے بارے میں لکھنے والے کا ایک تاثر ہے جسے وہ کوشش کرتا ہے کہ کبھی لطیفہ طرازی کے سائے میں اور کبھی اپنے تخلیقی تخیل سے ہم آمیز کر کے اس طرح سے پیش کرے کہ پڑھنے والا اسے کسی نثری نظم سے مماثل بھی خیال کر سکتا ہے اور چاہے تو لاکھ پردوں میں چھپتی کسی شخصیت کی محض ایک جھلک جو دیکھنے والی آنکھ کے اس دعوے کے باوجود کہ میں سب کچھ جانتی ہوں تجسس کا ایک نیا در کھولے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نئے ہیڈ میں فیض احمد فیض

Scanned by CamScanner

جیسی شخصیت پر ڈاکٹر ایوب مرزا سے لے کر عفت ذکی تک اور حمید اختر سے لے کر منو بھائی تک اتنا کچھ لکھا گیا مگر محسوس ہوتا ہے کہ تخلیقی فنکار کی پوری شخصیت کو گرفت میں لینے کے لیے ہر اسلوب اور ہر تکنیک ناکافی ثابت ہوتی ہے اس کی ایک بڑی مثال محمد حسن عسکری کی شخصیت ہے۔ ہمارے ہاں ادب کی دنیا میں فیض احمد فیض، محمد حسن عسکری اور ن م راشد کو فکری اور شخصی سطح پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا سمجھا جاتا ہے مگر تینوں کے بارے میں ڈاکٹر آفتاب احمد نے اس طرح سے شخصیت نگاری کی کہ ایک طرف تو کسی چونکا دینے والے ڈرامائی عنصر کی کم یابی کے باوجود ان کی شخصیتوں کے گہرے نقوش مرتب ہوئے اور دوسری طرف لکھنے والا اپنی ذات کو پس منظر میں رکھنے کے باوجود اور زیادہ نمایاں ہو کر آیا جس سے احساس ہوا کہ کوئی بڑی شخصیت پر لکھنے سے بڑا نہیں ہو جاتا بلکہ بعض اوقات لکھنے والوں کا چھوٹا پن اور نمایاں ہو جاتا ہے مگر بڑی شخصیتوں کی بصیرتوں کو سمجھنے کے لیے لکھنے والے بھی اسی ذہنی سطح کے چاہییں اسی لیے میرے نزدیک بہت سارے اخباری کالم تحلیل ہو جاتے ہیں۔ تعزیت نامے اوراق سادہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں، سیرت نامے کچھ خوشبودار لوبانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں مگر ڈاکٹر آفتاب احمد جیسے مرقع نگار اپنی تحریروں سے نئے اسالیب اور نئے فنی وسائل کو جنم دیتے ہیں اور اس اسلوب اور فنی وسیلے کا منبع یہ ہے کہ لکھنے والا کم تر درجے کا تخلیق کار نہ ہو اور دوسرا یہ کہ محض ڈرامائیت یا سنسنی خیزی یا لذتیت کی عمر زیادہ نہیں۔

اردو میں کم و بیش نصف صدی تک مختصر افسانہ مقبول رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادبی جرائد افسانہ نمبر چھاپتے تھے اور ان کی طلب ہوتی تھی یا منٹو کرشن چندر بیدی، ندیم شوکت صدیقی اور دیگر کئی افسانہ نگار بار بار پڑھے جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ افسانہ ادبی منظر سے ہٹتا گیا ناول اور ڈرامہ بھی پڑھا گیا مگر یہ بھی سنجیدہ اور نیم سنجیدہ قارئین کو زیادہ متوجہ نہ کر سکا۔ اب حیرت انگیز طور پر سفرنامہ بھی مقبولیت کے بہت سے مراحل طے کر کے زوال کی طرف مائل ہے۔ اس تناظر میں یادداشتیں مرقع نگاریاں اور شخصی خاکے قبول عام کا درجہ پا رہے ہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ بہت کچھ عامیانہ انداز میں لکھا جا رہا ہے۔ جس میں سطحیت ہے خاص طور پر جو کتابیں ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے سابقہ باسوں یا اداروں کے بارے میں لکھی جاتی ہیں یا کچھ سابقہ رفیقان کار کے خلاف لکھی جاتی ہیں۔ ایسی دو کتابوں نے تنازعہ بھی پیدا کیا۔ جن میں ڈاکٹر صدیق جاوید کی دو کتابیں شامل ہیں جو مرزا حامد بیگ اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مبینہ علمی چوریوں کے بارے میں ہیں۔ ان میں ایک کتاب کی تو رونمائی بھی اس شان سے منائی گئی کہ ایک ہفتے بعد اس کتاب کا موضوع بننے والے ایک قلمکار اور ریٹائرڈ پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمٰن کی وفات ہو گئی مگر اس طرح کی چیزوں سے قطع نظر بھی کر لیں تو اس افق پر نئے ستارے ابھر رہے ہیں ان نئے ستاروں میں ایک طرف ۷۵ برس کی ایک خاتون حمیدہ اختر بھی ہے جس نے اپنے شوہر اختر حسین رائے پوری کی وفات کے بعد قلم اٹھایا اور حیرت انگیز طور پر اردو کے پہلے جاسوسی ناول نگار ظفر عمر کی اس بیٹی نے ادبی دنیا کو مسحور کر دیا۔ مولوی عبدالحق، مہاتما گاندھی اور دوسری بہت سی شخصیتوں پر اس خاتون نے جس انداز میں لکھا وہ

Scanned by CamScanner

اس لیے چولکا دینے والا ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی علمیت، فلسفیانہ ذہن، افسانہ نگاری، تنقید نگاری اور عالمی کلاسیک پر گہری نظر کا ایک زمانہ معترف ہے مگر حمیدہ اختر کی تحریروں سے احساس ہوتا ہے کہ بسا اوقات عورت جس طرح سے مختلف شخصیتوں کو دیکھتی اور سمجھتی ہے مرد وہ معنی نہیں پا سکتا اور خاص طور پر عورت کو اگر کبھی خواب میں بھی اس مرد کو دیکھنے کا موقع ملے تو چاہے وہ مولوی عبدالحق کیوں نہ ہو وہ عورت کی گود کوترسنے والا ایک بچہ بن جائے گا۔ اسی طرح نثار عزیز بٹ کی یادداشتوں نے بھی ادبی دنیا پر جگمگانے والی بعض شخصیتوں کے بارے میں وہ نقش دکھائے ہیں جو اس سے پہلے نہ ان کی کتابوں میں تھے نہ ان کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں میں۔ خاص طور پر عزیز احمد کے حوالے سے جس نے اپنی اس نوجوان مداح کو ترغیب دی تھی کہ ہوٹل میں آ کر ان سے ملے۔ ماجرا یہ ہے کہ مردانہ وقار اور بالادستی پر قائم اس معاشرے کا بھرم اس وقت تک ہے جب تک عورت اپنی زبان نہیں کھولتی اگر وہ سچ مچ بولنے پر آ جائے تو یہ پورا معاشرہ ایک دفعہ Deconstruct ہو جائے اور اس میں سے نئے معنی سامنے آئیں اس طرح خود ادبی دنیا کی بعض روایات بھی تبدیل ہو جائیں گی۔ اسالیب اور تکنیک کے موجود پیمانے بھی منہدم ہو جائیں گے مگر ایک نیا جہاں معنی پیدا ہوگا جو بلاشبہ شخصیت نگاری کی بدولت ظہور پذیر ہوگا جس کے امکانات اس صنف کی مقبولیت کے باعث دکھائی دیتے ہیں۔

اردو میں شخصیت نگاری کے حوالے سے مختلف شخصیت نگاروں کے رجحانات، اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے تجزیہ کریں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مختلف شخصیات نگاروں نے اپنے اسلوب، سوچ وفکر، ذہنی اپج اور پسند و ناپسند کے لحاظ سے الگ راہیں نکالی ہیں۔ جن کی بدولت جہاں بعض شخصیتوں کے مخفی پہلو بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ وہاں ایک مکمل اور بھرپور تاثر بھی سامنے آتا ہے۔ جہاں شخصیت نگاری میں مشاہدہ، حقیقت اور اسلوب کی شگفتگی کو اہمیت حاصل ہے وہاں مردم شناسی کا جوہر اور نفسیاتی آگاہی ایک اچھے شخصیت نگار کا بنیادی وصف ہے جس کی ناقدین نے صاحب اسلوب شخصیت نگاروں کے بارے میں اپنی تنقیدی آرا کا اظہار کیا ہے اور ان کی تمام خوبیوں کا اسلوب اور موضوع دونوں تناظرات میں جائزہ لیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب میں محمد حسین آزاد کے قلمی مرقعے اس فن کے ابتدائی نمونے ہیں لیکن اس کی باقاعدہ ابتدا فرحت اللہ بیگ کی ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی سے ہوتی ہے جس میں عقیدت واحترام کی حدود کو قائم رکھتے ہوئے نذیر احمد کی خوبیوں اور بشری کمزوریوں کو توازن واعتدال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بقول رشید احمد صدیقی کے ''گنج ہائے گرانمایہ'' اور ''ہم نفسان رفتہ'' کے خاکوں (شخصی مرقعوں) میں بے لوث محبت ایک اہم قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا انداز مثبت ہے اور ان کے بے مثل اسلوب نے خوب پروان چڑھایا ہے۔''

اسی طرح مولوی عبدالحق کی شخصیت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

''مولوی عبدالحق نے چند ہم عصر میں عظمت کردار کو اہمیت دی ہے اور سرسید حالی اقبال اور محسن الملک جیسی بڑی شخصیات کے ساتھ نور خاں اور نام دیو جیسے کرداروں کو بھی محبت کی نظر سے دیکھا ہے چنانچہ انہیں اس صنف میں ایک سنگ میل کی حیثیت دی گئی ہے۔(۵)

ڈاکٹر انور سدید منٹو کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''سعادت حسن منٹو اس دور کے سب سے زیادہ حقیقت پسند اور بے باک خاکہ نگار ہیں (یہاں خاکہ نگار سے مراد شخصیت نگار ہی ہے) انہوں نے لاؤڈ سپیکر اور گنجے فرشتے کے خاکوں میں شخصیت کو صابن سے دھو کر اور اجلے کپڑے پہنا کر پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ باری علیگ، اختر شیرانی اور نور جہاں کو منٹو نے جس طرح بے آرائش اور حقیقی صورت حال میں پیش کیا ہے، اس سے منٹو کی بے رحم حقیقت نگاری کا ایک خصوصی زاویہ سامنے آتا ہے۔(۶)

فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی اور منٹو کے بارے میں ان آراء کا حوالہ اس مقصد کے لیے دیا گیا ہے کہ مختلف شخصیت نگاروں کے انفرادی مختلف النوع رویے سامنے آجائیں تاکہ اردو میں شخصیت نگاری کی بہت سی جہتوں کو بیان کیا جاسکے۔ شخصیت نگار سب کچھ کھلے کھلے انداز میں بیان کر دیتے ہیں اور یوں اپنے آپ کو سچائی کا علم بردار کرتے ہیں۔ درست ہے کہ شخصیت نگار کو تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنے ممدوح کو سامنے لانا چاہیے۔ مگر ہر بات نہ تو لکھنے کی ہوتی ہے اور نہ بتانے کی۔ بعض جگہ پر پردہ داری بھی ایک خصوصیت ہے جو بہت سارے شخصیت نگاروں میں دکھائی دیتی ہے۔

ایک دانشور کا خیال ہے کہ جہاں تک شخصیت نگاری کا تعلق ہے چونکہ اس کا تحریر کرنے والا دوسرا شخص ہوتا ہے اس لیے اسے نہ تو کسی قسم کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی ڈر بلکہ وہ بلا جھجک سب کچھ بیان کر دیتا ہے۔ معائب بھی اور محاسن بھی اور کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔ البتہ اسے اپنے ممدوح سے ہمدردی کی ضرورت ضرور ہوتی ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ بعض حقائق سے گریز کرتا ہے۔

اس بیان کی روشنی میں سب سے بڑی مثال مولانا حالی کی ''حیات جاوید'' ہے اور اس کے برعکس فرحت اللہ بیگ کی ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی ہے۔ شخصیت نگاروں کے ان دو رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ شخصیت نگاری کے ضمن میں ایک طرف منٹو ہے۔ شاہد احمد دہلوی ہے تو دوسری طرف محمد طفیل، مرزا ادیب اور ضمیر جعفری ہیں۔ پھر ایک رویے کی علم بردار عصمت چغتائی ہے تو دوسرا رویہ عبادت بریلوی، شوکت تھانوی اور فکری تونسوی کے ہاں نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عارف نے اپنے مقالے'' شاہد احمد دہلوی، حالات و آثار'' میں شاہد احمد دہلوی کی

Scanned by CamScanner

شخصیت نگاری کا ان کے ہم عصر شخصیت نگاروں سے موازنہ کرتے ہوئے جو مثالیں دی ہیں ان سے اردو میں شخصیت نگاری کے متنوع خدوخال سامنے آجاتے ہیں۔

ان مثالوں کی روشنی میں کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو موضوع اور مصنف کا تعلق، گوشت پوست کے انسان کی چلتی پھرتی تصویریں، اس سے متعلق واقعات کا تانا بانا یا انتخاب شخصیت کے بارے میں مواد اور اس کے سراپا کے بارے میں مشاہدے، قوت اور ان سب پر متضاد اسلوب بیان کا رنگ..... چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ دور سرسید سے ۱۹۸۵ء تک ڈیڑھ عشروں تک جس طرح شخصیت نگاری نے ہر حوالے سے اردو ادب پر بے پناہ اثرات مرتب کیے۔ خاص طور پر موجودہ دور میں شخصیت نگاری نے ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کی ہے اور یوں اس صیغے میں ہر اعتبار سے اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر حسن وقار گل نے اپنے تحقیقی مقالے ''اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد'' میں درست لکھا ہے کہ:

> ''موجودہ دور میں جو ادب منظر عام پر آیا اس کا تعلق ان تمام شخصیات سے ہے جو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتی ہیں ان میں علمی، ادبی، سماجی، تاریخی، مذہبی، فنی اور سیاسی شخصیات کے حالات نہایت ذوق سے لکھے گئے۔ ان کے لکھنے والوں کا مختلف دبستانوں سے تعلق ہے۔ کسی نے مولانا الطاف حسین حالی کی پیروی کی۔ کسی نے مولانا شبلی کو رہنما بنایا۔ ایسے بھی ہیں جن میں جوش عقیدت وارادت حد سے متجاوز نظر آتا ہے۔''(۷)

اس رائے سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ شخصیت نگاری کو فنی اور اسلوبیاتی اعتبار سے جو تقویت ملی اس کی وجہ سے ادب میں عام طور پر اور شخصیت نگاری میں خاص طور پر نئے رویے اور نئے رجحانات در آئے ہیں جس کی وجہ سے آج بھی شخصیت نگاری کو بڑی مقبولیت حاصل ہے اور ادب کی نثری اصناف میں کسی نہ کسی حوالے سے شخصیت نگاری دکھائی دیتی ہے۔

اس صورت حال میں یہ تنقیدی محاکمہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اردو میں شخصیت نگاری کا مستقبل بڑا روشن اور تابناک ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں مشفق خواجہ اور عطاالحق قاسمی نے کالم نگاری میں بھی شخصی مرقعے مختصر طور پر ہی سہی تحریر ضرور کیے ہیں۔ وہاں نئے لکھنے والوں کی ایک ایسی کھیپ اپنے قلم کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے جو خاص طور پر طنز و مزاح کو اپنا ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کے مزاح کی کوکھ سے ایک نئی نسل وجود میں آئی ہے ان میں سے بعض خود بھی تخلیقی جوہر رکھتے تھے۔ بعض نے اس فیض رسانی کو اپنی نثر کی تخلیقی قوت بڑھانے میں صرف کیا اور بعض نے ان کے بعض فقروں پر اس طرح تصرف کیا کہ ساتھ توسیع بھی کرتے چلے گئے اور یوں مقبولیت کے جھنڈے گاڑتے گئے۔ ڈاکٹر یونس بٹ ان خوش نصیب مزاح نگاروں میں سے ہیں جنہیں بے پناہ مقبولیت ملی۔ ان کا تخلیقی شجرہ مشتاق احمد یوسفی سے ملتا ہے۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ مشتاق احمد یوسفی محض لطیفوں کو جمع کر کے اتنے

Scanned by CamScanner

بڑے مزاح نگار نہیں بنے ان کا سیاسی وسماجی شعور بھی ہے، عالمی ادب کا مطالعہ بھی اور زبان کے رس اور جوہر سے آگاہ بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک طبعی بشاشت کا احساس رکھتے ہیں۔ یونس بٹ میں زیادہ تر وہ اوصاف ہیں جو ایک متوسط قاری کے اندر گدگدی پیدا کرتے ہیں اس لیے وہ شخصیات پر لکھتے وقت کچھ تو مقبول عام لطائف جمع کرتے ہیں ان میں توسیع کرتے ہیں اور پھر ان شخصیات پر منطبق کرتے ہیں۔ یونس بٹ کی دوسری بڑی خصوصیت کسی بھی شخصیت کی کمزوری کا شگفتگی سے تذکرہ ہے جو تلخ نوائی کا شائبہ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بڑی اپنائیت سے ذکر کرتا ہے۔ بڑی شخصیات سے اگر بے تکلف ہوتا ہے تو ہجو نگاری نہیں کرتا بلکہ بڑی ملائمت سے کمزوریوں کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اور ابن انشا ذو معنویت سے یا ضرب المثال اور محاوروں کی تحریف سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔

شخصیات کی یاد تازہ رکھنے کے حوالے سے رسائل کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ غالب نمبر، اقبال نمبر، فیض نمبر، جگر نمبر، حفیظ جالندھری نمبر، سرسید نمبر، سلیمان ندوی نمبر، حسرت موہانی نمبر، ابوالکلام آزاد نمبر اور ایسے ہی بہت سے خاص نمبر شائع ہوئے ہیں۔ جن کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خصوصی شماروں کو مناسب منصوبہ بندی سے مرتب کیا جائے۔ سوانح عمری، شخصیت اور اوصاف و کارناموں کے علیحدہ علیحدہ حصے مخصوص کیے جائیں اور ماہرین سے مقالات بھی تیار کرائے جائیں۔ اس طرح کوئی شعبہ تشنہ نہیں ہوگا۔ رسائل نے شخصیت نگاری کی نشو ونما میں اہم فرض ادا کیا۔ آج کوئی بھی رسالہ یا شمارہ اٹھا کر دیکھیں اس میں کسی نہ کسی کا شخصی مرقع ضرور ہوتا ہے۔ رسائل کا دائرہ کار وسیع ہوتا ہے۔ مذہبی رسائل میں مذہبی شخصیات، ادبی رسائل میں ادبی شخصیات، تاریخی جریدوں میں تاریخی شخصیات کے حالات زندگی، واقعات معلومات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ جو کہ موثر اور فعال ہوتا ہے، اس میں ایسے پروگرام ہونے چاہیں جس سے قوم کو سدھارنے اور نوجوانوں کو ذہنی تربیت دینے کے لیے ایسی شخصیات کے انٹرویو کیے جائیں جو نابغہ روزگار ہوں اور اس طرح قوم میں بے مقصدیت اور خلفشار کو ختم کر کے انہیں جلا بخشیں۔ نئی روشنی ان کے قلوب میں تب وتاب دے اور وہ بڑی شخصیات کی زندگی اور واقعات سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کے جو تنقیدی اور تحقیقی مقالے یونیورسٹیوں میں لکھے جا رہے ہیں ان کا پہلا باب شخصیت نگاری کے ذیل میں آتا ہے۔ یوں میں سمجھتی ہوں کہ آنے والا دور شخصیت نگاری کے فروغ میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اس لیے کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے تمام زبانوں کے علوم سے جس طرح استفادہ کی صورت نکلی ہے۔ اس کی بدولت لکھنے والوں کے مشاہدات اور تجربات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے یوں عالمی نظام میں گلوبلائزیشن کے حوالے سے جو نیا انداز فکر پیدا ہوا ہے اس کی بدولت اس صنف کا مستقبل جاندار بھی ہے اور شاندار بھی۔

Scanned by CamScanner

ماخذ

۱۔ احمد بشیر، جو ملے تھے راستے میں، چھپن چھری، ص ۲۵۹

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۲

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً، ص ۲۶۸

۵۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۵۸۹

۶۔ ایضاً، ص ۵۹۰

۷۔ ڈاکٹر وقار حسن گل، اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، ص ۳۰، ادارہ تصنیف و تالیف، کراچی

Scanned by CamScanner